August 2022

ماہنامہ

رائے بریلی

پیام عرفات

حقیقی آزادی کی تلاش

''یقیناً آزادی بڑی نعمت اور زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے اور اس کے لیے جو قربانیاں کی جائیں وہ بجا ہیں، ہم کو ان رہنماؤں کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے آزادی کی جنگ لڑی اور ملک کو آزاد کرایا، لیکن میں نہایت صفائی سے عرض کروں گا کہ ہماری یہی طاقت اور فیصلہ کی قوت جس کی بدولت ہمارے ملک سے غلامی کی لعنت ختم ہوئی، اگر اس سے زیادہ حقیقی اور مکمل آزادی کے حصول اور انسانیت کی تعمیر اور ترقی اور انسان کو انسان بنانے کے کام پر صرف کی جاتی تو یہ دنیا کا سب سے اہم کام اور مشکلات و مسائل کا اصلی اور مستقل حل ہوتا، میں آزادی کی تحریک کی تحقیر اور ناشکری نہیں کرتا، مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دنیا کا سب سے عظیم الشان کام اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انسان حقیقی انسان بن جائے۔''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مركز الإمام أبي الحسن الندوي

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

''اے عزیزان من! درد والم کی پاک دعوتیں صرف اس روانی آب تسلسل صدا اور ہنگامہ غوغا ہی کے لیے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں، فغانوں اور ماتموں کے نام سے ظہور میں آجائیں اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لیے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی، کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور کتنے ہی جنگل شور وغوغا سے ہنگامہ زار ہیں، بلکہ یہ دعوت، یہ پکار، یہ طلب، یہ ''ہل من مجیب'' فی الحقیقت ان آنسوؤں کے لیے ہے جو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ دل سے نہیں، وہ ان آہوں کا دھواں مانگتی ہے جن کی لپٹیں صرف منہ ہی سے نہیں بلکہ اعماق قلب سے اٹھیں، وہ صرف ہاتھوں ہی کے ماتم کے لیے نہیں پکارتی، بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت کے لیے تشنہ ہے، اگر تمہارے پاس اس کے لیے آنکھوں کا آنسو نہ ہو تو اسے کوئی شکایت نہیں، لیکن آہ تمہاری غفلت، اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو جس سے پانی کی جگہ خون بہے، اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آہ یہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس، عبرت کی ایک ٹپک، بصیرت کی ایک تڑپ، احساس صحیح وحق کا ایک اضطراب بھی نہیں۔

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اللہ اللہ سید الشہداء مظلوم کی مظلومی اور یا للعجب غفلت ونادانی کی بوقلمونی! اس سے بڑھ کر دنیا میں ''مظلومی'' کی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں دونوں نے اس پر ظلم کیا، دشمنوں نے اس کی شہادت عظیمہ کی عظمت مٹانی چاہی مگر دوستوں نے بھی اس کی شہادت کی اصلی تقدیس وشرف کے لیے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہایا، دشمن تو دشمن تھے اس لیے انہوں نے اس کی دعوت حق کو مٹانا چاہا، مگر دوست دوست ہو کر بھی اس کی دعوت کی پیروی نہ کر سکے۔

پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ ہی کا نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو اور دعوت درد کا اصلی جواب وہی ہے جو عبرت وبصیرت کی زبان سے نکلے، تمہاری آنکھیں اس حادثہ پر بہت رو چکی ہیں، مگر اب تمہارے دل کا رونا باقی ہے اور اگر روتا ہے تو اپنے دل کو رلاؤ، ورنہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجیے، جس میں دل کی اشک فشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے، حالانکہ انسان کی ساری کائنات حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

ضرورت ہے اس کہ حادثہ عظیمہ پر غور وفکر کی ایک نئی صف ماتم بچھائیں اور ان حقیقتوں اور بصیرتوں کی جستجو میں نکلیں جن پر آنکھوں کی اشک افشانیوں سے زیادہ دل کے زخموں سے خون بہتا ہے اور ہاتھوں سے زیادہ روح پر ماتم طاری ہوتا ہے۔﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾''

(شہید کربلا:۶-۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۴ — محرم الحرام ۱۴۴۴ھ - اگست ۲۰۲۲ء — شمارہ: ۸

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

امت مسلمہ کی آبرو

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"أَنَا أَمَنَةٌ لِأَصْحَابِي، فَإِذَا ذَهَبْتُ أَتَى أَصْحَابِي مَا يُوْعَدُوْنَ، وَأَصْحَابِيْ أَمَنَةٌ لِأُمَّتِي فَإِذَا ذَهَبَ أَصْحَابِي أَتَى أُمَّتِي مَا يُوْعَدُوْنَ"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(میں اپنے صحابہ کی آبرو ہوں، تو جب میں رخصت ہوجاؤں گا تو میرے صحابہ پر وہ وقت آئے گا جس کا وعدہ ہے (فتنہ وفساد)، ٹھیک اسی طرح میرے صحابہ میری امت کی آبرو ہیں، لہٰذا جب وہ نہ رہیں گے تو میری امت پر بھی وہ گھڑی آجائے گی جس کا وعدہ ہے۔)

(صحیح مسلم: ۲۵۳۱)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسیٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 — E-Mail: markazulimam@gmail.com — سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

بقائے انفع کا بے لاگ قانون (اداریہ)..................۳

..............................بلال عبدالحی حسنی ندوی

اہل بیت کی سیرت و کردار- تاریخ کے آئینہ میں ۴

.............مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعات کی حکمت.......۶

.....................حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

یوم آزادی کا پیغام..................................۸

.......................مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

سچائی کیا ہے؟ (جاری)...............................۹

..............................بلال عبدالحی حسنی ندوی

نکاح کے چند مسائل (۳)..............................۱۰

..............................مفتی راشد حسین ندوی

خالق حقیقی کا نظام ارض وسماں........................۱۴

..............................عبدالسبحان ناخداندوی

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ- بحیثیت اردو ادیب.......۱۷

..............................محمد ارمغان بدایونی ندوی

اسلام اور انسانیت کی مسیحائی..........................۱۹

..............................محمد نفیس خاں ندوی

یہ قدم قدم بلائیں

نتیجۂ فکر:- جناب عامر عثمانی

نہ سکت ہے ضبطِ غم کی، نہ مجال اشک باری
یہ عجیب کیفیت ہے نہ سکوں نہ بے قراری
ترا ایک ہی ستم ہے ترے ہر کرم پہ بھاری
غم دو جہاں سے دے دی مجھے تو نے رست گاری
مری زندگی کا حاصل ترے غم کی پاسداری
ترے غم کی آبرو ہے، مجھے ہر خوشی سے پیاری
یہ قدم قدم بلائیں یہ سواد کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری
ترے جاں نواز وعدے مجھے کیا فریب دیتے
ترے کام آگئی ہے مری زُود اعتباری
مری رات منتظر ہے کسی اور صبح نو کی
یہ سحر تجھے مبارک جو ہے ظلمتوں کی ماری
وہی پھول، چاک دامن، وہی رنگ اہل گلشن
ابھی صرف یہ ہوا ہے کہ بدل گئے شکاری
مری عافیت کے دشمن مجھے چین آ چلا ہے
کوئی اور زخم تازہ کوئی اور ضرب کاری
مجھے لے چلا بہا کر غم زندگی کا دھارا
غم عشق یاوری کر، ہے مقام شرمساری
جو غنی ہو ما سوا سے وہ گدا گدا نہیں ہے
جو اسیر ما سوا ہو وہ امیر بھی بھکاری

بلال عبدالحی حسنی ندوی

بقائے انفع کا بے لاگ قانون

دنیا بڑی بے لاگ ہے، نہ وہ قوم دیکھتی ہے نہ مذہب، کسی خاندان یا قبیلہ سے اس کا کوئی رشتہ نہیں، منصب ووجاہت سے بھی اس کا کوئی لینا دینا نہیں، وہ دو دو چار کی طرح فیصلے کرتی ہے، وہ یہ بھی نہیں دیکھتی کہ کون فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ کون کتنا فائدہ پہنچاتا ہے، اس کے فیصلے اسی نافعیت کی بنیاد پر ہوتے ہیں، جو جتنا زیادہ فائدہ پہنچائے، کسی بھی حیثیت سے وہ جتنا زیادہ سودمند ہو وہ اس کی قدرداں ہے، بقائے انفع کا یہی وہ دستور ہے جو دنیا میں چلا آرہا ہے، اس سلسلہ میں اس کے یہاں کوئی لوچ لچک نہیں، جو جتنا زیادہ فائدہ پہنچائے گا وہ باقی رہے گا، اس کی حفاظت کی جائے گی، دنیا کی کوئی طاقت اس کو فنا کے گھاٹ نہیں اتار سکتی اور جب تک اس کی یہ نافعیت باقی ہے وہ خود بھی باقی ہے اور یہ خصوصیت جتنی کم ہوتی جائے گی اور اس کی بنیاد جتنی کمزور ہوتی جائے گی، اس کا وجود خطرہ میں پڑتا چلا جائے گا۔

دنیا کی ہر چیز کے بارے میں یہی فیصلہ ہے، خواہ وہ اشرف المخلوقات ہو یا کوئی بھی مخلوق ہو، ایک کمہار برتن بناتا ہے، جو مٹی برتن بنانے کے لائق نہیں ہوتی اس کو پھینک دیا جاتا ہے، اس لیے کہ اس میں فائدہ پہنچانے کی صلاحیت ختم ہوگئی، اب وہ کمہار کے کام کی نہیں رہی۔

یہی اللہ کا فیصلہ ہے، ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ (الرعد: ۱۷)

(بس جھاگ تو بیکار جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے)

سودمندی جس طرح کی بھی ہو، کسی حیثیت سے بھی کوئی چیز فائدہ پہنچا سکتی ہو، آخرت کے فوائد اس سے حاصل ہوں یا دنیا کے، اس کی بقاء کے فیصلے ہوتے ہیں، آخرت کے فوائد یقیناً سب سے بڑھ کر ہیں، لیکن دنیا کے بارے میں فیصلہ خداوندی یہی ہے۔

دنیا کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جن قوموں نے نافعیت ثابت کی، ہزار خرابیوں کے باوجود دنیا میں ان کا تسلط قائم رہا، مسلمانوں نے جب تک دنیا کو فائدہ پہنچایا، دین کا بھی دنیا کا بھی، تقریباً ایک ہزار سال کی ان کی تاریخ یہی رہی ہے کہ کوئی ان کو ہلا نہ سکا، پھر یورپ نے جب ایجادات کے میدان میں قدم رکھا اور دنیا نئے نئے انکشافات وایجادات سے پٹ گئی تو آج ہزار خرابیوں کے باوجود وہی میدان عمل میں ہیں۔

مسلمانوں کے پاس بہت کچھ تھا اور ایک طویل دوران کا ایسا گذرا ہے کہ انہوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا اور سب سے بڑھ کر ایمان واخلاق کی جو دولت تقسیم کی اس سے دنیا میں بہار آگئی، افسوس کی بات یہ ہے کہ آج مسلمان تہی دست ہوگئے، نہ وہ خود دولت خداداد سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ دنیا میں اس دولت کو تقسیم کرنے کے لیے تیار ہیں، اس کا نتیجہ کھلا ہوا سامنے ہے نہ اپنے ملکوں میں ان کو سکون ہے نہ دنیا کے اور کسی ملک میں۔

مسلمانوں کی پستی کا راز یہی ہے کہ انہوں نے ایمان واخلاق کی دولت گنوادی، جو ان کا سب سے بڑا سرمایہ تھا اور اس دولت کو تقسیم کر کے انہوں نے دنیا کو جنت نشاں بنادیا تھا، آج وہ خود اس سے تہی دست ہوتے جارہے ہیں، ضرورت اسی کی ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ مستحکم کریں اور دنیا کو اخلاق وکردار کے جوہر سے آراستہ کریں اور جہاں بھی وہ اقلیت میں ہیں وہاں وہ ثابت کریں کہ وہ انسانوں کی ضرورت ہیں، اس ملک کی ضرورت ہیں، اپنے اندر وہ جتنی نافعیت پیدا کریں گے، ضرورت مندوں کے کام آئیں گے، محبت وانسانیت کا پیغام عام کریں گے، ایمان واخلاق کی طاقت سے مسلح ہوکر میدان میں آئیں گے، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنا ایک مقام پیدا کرلیں گے، پھر ان کو کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا، ہر شخص ان کی ضرورت محسوس کرے گا، ایسی ضرورت کہ جس سے کسی کو مفر نہ ہو۔

اہل بیت کی سیرت وکردار تاریخ کے آئینہ میں

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

خاندان نبوت کے افراد، اہل بیت کرام، سیدنا علی مرتضیٰؓ اور ان کی اولاد امجاد اپنی اس نسبت گرامی کے بارے میں جوان کو سرور کائنات، مفخر موجودات رسول اللہ ﷺ کی ذات سے حاصل تھی، بڑے غیور وخوددار واقع ہوئے تھے، وہ دوسرے مذاہب اور قوموں کے دینی پیشواؤں کے خاندانوں اور فرزندوں کی طرح جن کو ان مذاہب کے پیرو ہر حال میں عظمت وتقدیس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے ساتھ مافوق البشر ہستیوں کا سا معاملہ کرتے ہیں، اپنی اس نسبت ونسب سے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھاتے تھے اور ''استخواں فروشی'' اور مفت خوری سے کوسوں دور رہتے تھے، تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں ان کی خودداری، عزت نفس اور استغنا وبے نیازی کے جو واقعات آئے ہیں ان سے ان کی سیرت وکردار کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ دوسرے ادیان وملل کے اس دینی طبقہ (برہمنوں اور پروہتوں) سے بہت مختلف ہے، جن کو پیدائشی تقدس اور عظمت حاصل ہوتی ہے اور جن کو اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے کسی محنت وکوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سیدنا حسن بن علی کسی ضرورت سے بازار گئے، انہوں نے ایک دکان سے کچھ مال خریدنا چاہا، دکاندار نے اس کے اصل دام بتائے پھر کسی کے اشارہ کرنے یا کسی قرینہ سے اس کو علم ہوگیا کہ یہ نواسہ رسول حسن بن علی ہیں، اس نے فوراً دام کم کردیے اور خصوصی رعایت کرنی چاہی، حضرت حسنؓ مال چھوڑ کر واپس آگئے اور فرمایا کہ میں اپنی نسبت سے یہ فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا کہ میرے ساتھ رعایت کی جائے۔

سیدنا علی بن حسینؓ (زین العابدین) کے رفیق وخادم خاص جویریہ بن السماء کہتے ہیں کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی قربت کی بنیاد پر کبھی ایک درہم کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔

یہی سیدنا علی بن زین العابدین جب سفر کرتے تھے تو اپنے نام ونسب کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے، لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں اس نسبت سے فائدہ اٹھاؤں اور دوسروں کو فائدہ نہ پہنچاؤں۔

حضرات اہل بیت اور شیر خدا حضرت علیؓ کے ابناء واحفاد اس جوہر شجاعت وشہامت سے آراستہ تھے، جو خاندان نبوت کا شعار اور سیدنا علی مرتضیٰ اور حضرت حسین شہید کربلا کی میراث تھی، ان کا عمل عزیمت، جرأت کے ساتھ اعلان حق، حفاظت دین اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے سلسلہ میں ہر طرح کے خطرات برداشت کرنے اور اپنے اور اپنے اہل تعلق کے مصائب میں مبتلا ہونے کی پروانہ کرنے پر تھا، سیدنا علی زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی نے ۱۲۲ھ میں خلیفہ اموی ہشام بن عبدالملک بن مروان کی حکومت میں (جو اپنے وقت کی عظیم ترین اور مستحکم ترین حکومت تھی) خروج کیا اور حکومت کی بڑی بڑی فوجوں پر فتح پائی، آخر میں شہادت سے سرخ رو ہوئے، ان کو سولی دی گئی اور چار سال تک مصلوب رہے۔

رجب ۱۴۵ھ میں حضرت حسن کے پرپوتے محمد بن عبداللہ المحض بن حسن مثنی بن حسن بن علی بن ابی طالب معروف بذوالنفس الزکیہ نے خلیفہ منصور عباسی کے خلاف مدینہ طیبہ میں خروج کیا اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں بصرہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اسلام کے دو عظیم ترین فقہی مکاتب مذہب مالکی ومذہب حنفی کے دونوں جلیل القدر اماموں، امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے ان کی بیعت وحمایت کا فتویٰ دیا، امام ابوحنیفہ نے مالی نذرانہ بھی پیش کرکے اپنی حمایت ونصرت کا اظہار فرمایا، جو بعد میں منصور کے عتاب وسرزنش کا سبب بنا، محمد ذوالنفس الزکیہ نے

۱۵ر رمضان ۱۴۵ھ کو "احجار الزیت" کے مقام پر جو مدینہ منورہ میں واقع ہے، بڑے مردانہ وسرفروشانہ طریقہ پر شہادت پائی اوران کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے ۲۴ر ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں خلعت شہادت زیب تن کیا۔

اس کے برعکس ایسی کثیر التعداد تاریخی روایات ہیں جن سے اہل بیت کی بلند ہمتی، عزیمت پر عمل، مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور اجتماعیت کی فکر کی روشن شہادتیں ملتی ہیں، بابکی جو حضرت زید بن علی بن حسین کے خدام ورفقاء میں سے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت زید کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوا، جب نصف شب ہوئی اور ثریا (ستارہ) آسمان پر صاف نظر آنے لگا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ بابکی تم ثریا کو دیکھتے ہو، تمہارے خیال میں کوئی وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، انہوں نے فرمایا: خدا کی قسم! میری تمنا ہے کہ میرا ہاتھ اس پر ہو اور میں اس بلندی سے زمین پر گروں، جہاں بھی موقع ہو اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، مگر اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی امت میں صلح واتحاد کرادے۔

بعض مصنفین اور "محبین اہل بیت" بزرگان اہل بیت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں، جیسے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور دلچسپی غاصبین کے ہاتھ سے خلافت کا نکال لینا ہی تھا، یہی ان کا مقصد حیات اور مشغلہ زندگی تھا اور یہی ان کے اعصاب اور قویٰ فکریہ پر مستولی رہتا تھا، ان کو امت محمدی، اسلامی معاشرہ سے کوئی دلچسپی، اس کی تربیت واصلاح کی کوئی فکر، زہد وعبادت اور تبلیغ ودعوت سے کوئی سروکار نہ تھا، لیکن وہ تاریخ جو رنگ آمیزی سے پاک رہی ہے، وہ ان کی ایسی تصویر پیش کرتی ہے جو ان کے نسب ونسبت اور ان کے مقام عالی کے ہر طرح شایان شان اور قابل قیاس ہے، یہاں پر صرف حضرت جعفر صادق کی سیرت وکردار، ان کے اخلاق وشمائل، ان کی پاکیزہ نفسی، دنیاوی اغراض ومقاصد سے بے نیازی، اعلیٰ درجہ کے تقویٰ اور احتیاط اور دنیا سے بے رغبتی اور آخرت طلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام مالک ان کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ اکثر متوسم رہتے، لیکن جس وقت آنحضرت ﷺ کا نام نامی ان کی مجلس میں لیا جاتا تو چہرہ کا رنگ زرد وسبز ہو جاتا، میں عرصہ تک ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، جب کبھی دیکھتا انہیں باتوں سے خالی نہ پاتا، یا نماز میں مشغول ہیں یا روزے سے ہیں یا قرآن شریف کی تلاوت فرما رہے ہیں، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ بغیر طہارت کے انہوں نے کوئی حدیث بیان کی ہو، وہ کبھی غیر متعلق غیر ضروری بات نہ فرماتے، وہ ان عابدوں زاہدوں میں تھے جن پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے۔

امام جعفر کے اقوال وارشادات میں سے ہے فرماتے تھے کہ دین کے بارے میں کبھی بحث وجدال سے کام نہ لو، اس لیے کہ اس سے شک پیدا ہوتا ہے اور نفاق کی آبیاری ہوتی ہے۔ یہی حال ان کے اخلاف کرام کا تھا، جن کو اہل سنت اپنے اپنے عہد کے کبار اولیاء اللہ، علماء ربانی، مصلح وداعی دین اور امت کے لیے فکرمند وساعی سمجھتے ہیں اور حضرات امامیہ ان کو ائمہ اثنا عشریہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ان سادات کرام نے جن کی رگوں میں ہاشمی خون تھا، جب پورے طور پر اس کا اندازہ کرلیا کہ اب خلفائے بنی عباس کے خلاف علم جہاد بلند کرنا، جن کی حکومت ایشیا وافریقا کے وسیع اور متمدن ممالک پر حاوی تھی اور جن کے زیر سایہ اسلام دور دراز کے ملکوں تک پہنچ رہا تھا اور مرکز خلافت میں بھی امن وامان قائم تھا، علم دین کی اشاعت ہو رہی تھی اور اسلام کی تعلیمات ونظام کا بہت سا حصہ قائم تھا، انہوں نے کسی ایسی خوں ریزی وانتشار انگیزی سے احتراز کیا، جس سے بظاہر (ان کے خاندان کے پیشرو اصحاب جلادت وفتوت کی کوششوں کی طرح) کسی بڑے نتیجہ کے نکلنے کی امید نہیں تھی، ان کی یہ خاموشی اور مسلمانوں کی دینی نگرانی، باطنی واخلاقی رہنمائی کے کام میں مشغولیت وسرگرمی نہ کسی سہولت پسندی اور عافیت کوشی پر مبنی تھی، نہ اس اصول تقیہ پر عمل کرنے پر جس پر عمل وتلقین کی نسبت ان کی بلند شخصیتوں کی طرف کی گئی ہے۔

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعات کی حکمت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ سفر کیا اور تین خارق عادت واقعات دیکھے، جن پر ان سے ضبط نہ ہوا، اسی لیے حضرت خضر نے فرمایا کہ اب ہم دونوں آگے ایک ساتھ نہیں جائیں گے، یہیں سے جدا ہوجائیں گے، تاہم جدا ہونے سے پہلے ہم ان تینوں واقعات کی حکمت بیان کیے دیتے ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے سب سے پہلے کشتی کے متعلق بتایا کہ یہ غریب لوگوں کی کشتی تھی، جن کا وہی ذریعہ معاش تھا اور اسی سے ان کی روزی روٹی اور صبح وشام کا کھانا چلتا تھا، اس کشتی کا ملاح سمندر میں مسافروں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارہ تک پہنچاتا تھا اور ان سے اس کام کا کرایہ لیتا تھا، تو میں نے اس کشتی کو عیب دار کردیا اور اس میں خرابی پیدا کردی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں قریب ہی میں ایک بادشاہ تھا جو نئی کشتیوں پر اپنے استعمال میں لانے کے لیے قبضہ کرلیتا تھا۔ شاید وہ علاقہ ایسا ہوگا جہاں پانی وغیرہ کی کثرت ہوگی اور اس میں کشتی کی ضرورت زیادہ پڑتی ہوگی، تو بادشاہ بجائے اس کے کہ خود اپنی کشتیاں بنوائے، غریب لوگوں کی نئی کشتیاں چھین لیتا تھا، چونکہ یہ کشتی بھی نئی تھی، لیکن یہ غریب اور دین دار لوگوں کی کشتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کی کشتی بادشاہ کے دست غصب سے محفوظ رہے، اسی لیے ہم نے کشتی ایسی کردی کہ اگر بادشاہ کے ہرکارے لینے کے لیے آئیں گے تو اس میں عیب دیکھ کر اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔

اگر کوئی شخص حلال کمائی کا اہتمام کرے تو اس کے رزق میں برکت ہوتی ہے اور اللہ غیب سے اس کی حفاظت کے اسباب پیدا کرتا ہے، مذکورہ واقعہ اس کی واضح مثال ہے، اللہ نے بے چارے غریب لوگ جو محنت کی کمائی کرتے تھے، ان کی کشتی کو ظالم بادشاہ سے محفوظ رکھا، گویا ان پر رحم کیا اور ان کی کشتی کو بچالیا، ظاہر ہے اللہ نے انہی کی کشتی کو بچایا جنہوں نے محنت اور حلال کمائی سے گزارے پر قناعت کی، نہ کہ ہر شخص کی کشتی کو بچالیا، اگر ان کی کشتی چھن جاتی تو ان کا ذریعہ معاش باقی نہ رہتا اور وہ محنت کا جذبہ ہونے کے باوجود کمانے سے مجبور ہوتے، لیکن اللہ رزاق حقیقی ہے، اس نے رزق دینے کی ذمہ داری اپنے پاس رکھی ہے، وہی رزق دیتا ہے، اس لیے اس نے اپنے خاص بندوں کے ساتھ فضل کا معاملہ کیا اور مصیبت سے بچالیا، لیکن بعض مرتبہ بندہ اللہ کے اس فضل کو نہیں سمجھتا اور اس زعم میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ یہ روزی روٹی ہماری اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔

سورۂ کہف کے نزول کا مقصد یہی ہے کہ بندہ کو پتہ چل سکے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے کرنے سے ہوتا ہے نہ کہ بندوں کے کرنے سے، البتہ ظاہر میں یہی لگتا ہے کہ بندے کررہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیاوی نظام ذرائع پر منحصر رکھا ہے اور ظاہر میں انہی ذرائع سے فائدہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام ذرائع اللہ کے حکم سے کام کرتے ہیں اور جہاں پر ذریعہ وہ کام نہیں کرتا جو اللہ چاہتا ہے تو اللہ اپنی طرف سے دوسرا انتظام کردیتا ہے، جیسا کہ ظاہری ذرائع کے لحاظ سے مذکورہ قصہ میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ غریب لوگوں کی کشتی غصب ہوجاتی، اس لیے کہ بادشاہ کے ہرکارے آتے اور نئی کشتی دیکھتے تو انہیں پسند آجاتی اور اس کو اپنے ساتھ لے جاتے اور ان کا ذریعہ معاش فوت ہوجاتا، لیکن رزق اللہ دیتا ہے اور وہ اوپر سے یوں ہی نازل نہیں کردیتا، یا کسی کی جیب میں نہیں ڈال دیتا، بلکہ کسی نہ کسی ذریعہ سے رزق عطا کرتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان غریب لوگوں کے لیے ایک ایسا انتظام کردیا کہ ان کی آمدنی کا ذریعہ معطل نہیں ہوا۔

اس واقعہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ رزق ملنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے اور اس کو کارآمد یا بے کار بھی وہی بناتا ہے، مگر یہ انسان کی غلطی ہے کہ وہ اس ذریعہ کو اپنی تخلیق سمجھتا ہے اور سوچتا ہے کہ ہم نے اپنی سوچ سے ایک ذریعہ اختیار کیا، اس لیے ہمیں دولت مل گئی، لہٰذا اس میں کسی کا فضل وکرم شامل نہیں ہے، حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ ذریعہ پیدا کس نے کیا اور اس میں افادیت کی تاثیر کس نے رکھی؟ اگر وہ ذریعہ موجود ہی نہ ہوتا تو اس سے فائدہ اٹھانا کیسے ممکن ہوتا؟ ظاہر ہے جتنے بھی ذرائع ہیں وہ سب اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان میں وہی تاثیر ہے جو اس نے ودیعت کی ہے، چھری میں کاٹنے کی صلاحیت رکھی ہے، تو اب وہ کاٹنے کا ہی ذریعہ بنے گی، لیکن اگر اللہ چاہے تو وہ کسی دوسرے ذریعہ سے اس کی یہ خصوصیت ختم بھی کر سکتا ہے، معلوم یہ ہوا کہ تمام ذرائع اسی کے بنائے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ جب چاہے انہیں کارآمد بنا سکتا ہے اور جب چاہے ان میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔

دریا پار کرنے کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کی گردن دبا دی تھی، اس کے متعلق بتایا کہ اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے، جو اپنا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتے تھے، اس کی خوشنودی کے لیے زندگی گزارتے تھے اور گناہوں سے بچتے تھے، لہٰذا اللہ نہیں چاہتا تھا کہ مستقبل میں ان کو ان کی اولاد پریشان کرے اور ظاہری ذرائع والے نظام کی بنیاد پر یہ طے تھا کہ ان کا یہ لڑکا غلط راہ پر پڑ جاتا اور ایمان کی دولت سے محروم ہو جاتا، ظاہری ذرائع کے لحاظ سے ایسا اس لیے ممکن تھا کہ شاید اس علاقہ کے حالات خراب رہے ہوں گے اور وہاں کی نسل بگڑی ہوئی ہوگی، چونکہ آدمی بری صحبت سے بگڑتا ہے اور رفقاء کے اثر سے متاثر ہوتا ہے اور جیسا ماحول ہوتا ہے اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ یہ لڑکا مستقبل میں اپنے گاؤں کے برے ماحول کا شکار ہو جائے گا اور ایسی بری صحبت میں پھنس جائے گا کہ پھر یہ اپنے ماں باپ کے لیے ایک مصیبت ہوگا، چنانچہ اللہ نے اس برے وقت سے پہلے ہی ماں باپ کو آزمائش میں پڑنے سے بچا لیا اور ان کے ایمان کی حفاظت فرمائی، یعنی ظاہری ذرائع کے لحاظ سے حالات کے تحت جو کچھ ہونے والا تھا، اللہ نے اپنے بندوں کی نیکی کے پیش نظر اس میں تبدیلی کر دی، گرچہ فوری طور پر لڑکے کی جدائیگی پر انہیں سخت صدمہ لاحق ہوا ہوگا، مگر اللہ نے آہستہ آہستہ ان کا یہ غم بھلا دیا ہوگا اور انہیں اس سے بہتر اولاد سے نوازا ہوگا، اس لیے کہ اللہ اپنے مومن بندوں کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو انہیں دوہرا اجر دیتا ہے اور اپنا قرب خاص عطا کرتا ہے۔

صحبت کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے، دنیا کا نظام یہی ہے کہ آپ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں گے، ویسی ہی چیزیں آپ کے ہاتھ میں آ جائیں گی، اگر رفقاء خراب مل جائیں تو کتنے لڑکے ہیں جو اپنے ساتھیوں کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں اور اگر رفقاء اچھے مل جائیں تو کتنے لڑکے ہیں جو ساتھیوں کی وجہ سے اچھے بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ یہاں انسان انسان سے سیکھتا ہے اور حالات اس کے لیے ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں، جن کی بنیاد پر وہ کام انجام دیتا ہے، مگر نادان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ اپنی فہم وفراست کی وجہ سے کر رہا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے آخری واقعہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے جس دیوار کو درست کیا تھا، دراصل وہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جس کے نیچے خزانہ دفن تھا اور وہ بچے اتنے چھوٹے تھے کہ نہ اس خزانہ کو نکال سکتے تھے اور اگر دیوار گر جاتی تو نہ ہی اس کی حفاظت کر سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوتا کہ محلّہ والے سب خزانہ لوٹ لے جاتے اور ان یتیم بچوں کا خاصا خسارہ ہو جاتا، لیکن چونکہ ان بچوں کے باپ نیک تھے، اس لیے اللہ نے والد کی نیکی کا صلہ انہیں دیا اور یہ چاہا کہ جب یہ بچے بالغ ہوں اور ان میں قوت پیدا ہو جائے تب یہ اس دفینہ کو نکال لیں، ظاہر ہے اللہ نے ان کے ساتھ باپ کی نیکی اور رحم کی بنیاد پر یہ معاملہ کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی کی نیکی اس کی اولاد تک پہنچتی ہے اور اس سے فائدہ ہوتا ہے۔

یوم آزادی کا پیغام

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

آج ہمارا ملک آزاد ہے، اس کے دروبست آزاد ہیں، ہم خود اس کی تقدیر کے مالک ہیں اور اس کے سیاہ وسفید کا فیصلہ کرتے ہیں، لیکن ہماری تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے، جب ہم خود اپنے وطن میں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے، ہم اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں تھے، ہمیں یہ آزادی کیوں کر حاصل ہوئی؟ اس آزادی کے جبین وعارض پر کس کس کے خون شہادت کی سرخی ہے؟ ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے ان سپوتوں، مادر وطن کے لائق فرزندوں اور اس کی عزت وناموس کے ان پاسبانوں کی یاد تازہ کریں۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ دنیا کے تمام انقلابات سے اس حیثیت سے جداگانہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں مذاہب اور مذہبی قائدین کا نمایاں کردار رہا ہے، بابائے قوم مہاتما گاندھی جی، مفسر قرآن مولانا ابو الکلام آزاد اور سکھ مذہبی رہنما تارا سنگھ، یہ سارے لوگ وہ تھے جو مذہب کی آغوش میں پلے اور ساری زندگی مذہب کے زیر سایہ گذار دی۔

۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں قدم رکھا اور بتدریج اپنی فوج اور پولیس بھی رکھنی شروع کردی، یہاں تک کہ ہندوستانیوں سے انگریزوں کا پہلا معرکہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں پہلے شہید آزادی سراج الدولہ کے ساتھ ہوا، یہ گویا انگریزوں کی طرف سے اس امر کا اعلان تھا کہ وہ اس ملک میں محض تجارت پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ اس ملک کی سیاسی تقدیر بھی اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔

انگریزوں سے دوسرا بڑا معرکہ ۱۷۶۴ء میں بکسر کے میدان میں میر قاسم کو شکست ہوئی، ادھر جنوب میں فرمانروائے میسور سے انگریزوں کی تین جنگیں ہو چکی تھیں، جن میں دوبار انگریز شکست کھا چکے تھے، ۱۷۹۹ء میں آخری معرکہ میسور ہوا اور بعض مسلم والیان مملکت کی غداری وجفا کاری کے باعث یہ معرکہ بھی ہندوستانیوں کے خلاف رہا، اسی معرکہ میسور نے ۱۸۰۶ء میں اس تحریک کی صورت اختیار کی جو ''غدر ویلور'' کہلاتا ہے اور جس کو بعض مؤرخین نے ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کا ریہرسل قرار دیا ہے۔

جہاں مرشد آباد اور بکسر کی شکست نے بنگال سے نواح دہلی تک انگریزوں کو غلبہ عطا کردیا، وہیں میسور کی فتح نے جنوب میں انگریزوں کے لیے مزاحمت ختم کردی اور حقیقت یہ ہے کہ خود دہلی میں بھی مغلیہ حکومت کی شمع سحری ۱۶؍ستمبر ۱۸۰۳ء ہی کو بجھ گئی تھی، جس دن شہنشاہ عالم نے برطانیہ کی سرپرستی قبول کرلی تھی۔

ہندوستانی کسانوں پر ٹیکسوں کا ناواجبی بوجھ، مقامی صنعتوں کی تباہی وبربادی اور ملک کے اصل باشندوں کے ساتھ تذلیل وتحقیر کے سلوک نے محبان وطن کو بے چین وبے قرار کردیا اور یہ بے قراری آخر ۱۸۵۷ء کی تحریک کی صورت آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑی، یہ وہ نشہ تھا جس نے ہندو اور مسلمان، برہمن اور شودر، زمین دار اور جاگیر دار اور زارع وکاشت کار سبھوں کو ایک صف میں لا کھڑا کیا، غور کیا جائے اور بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آزادی کے لیے ان تمام اہم معرکوں میں مسلمان پیش پیش تھے اور انہوں نے دشمنان وطن کو خون جگر کے جام بھر بھر کر دیے کہ ان کی تشنہ کامی دور ہو اور وطن کی عزت وآبرو سلامت رہ جائے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جو علاقے چھینے تھے، ان میں مراٹھوں، راجپوتانہ اور پنجاب کا علاقہ چھوڑ کر قریب قریب سبھی مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھے، اس لیے مسلمان ہی ان کا زیادہ نشانہ تھے اور فطری طور پر مسلمان ہی ان سے نبرد آزما بھی تھے، سر ولیم میور نے جو انٹلی جنس ریکارڈ جمع کیا ہے، اس کے مطابق ''بدذات مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیے، جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر کے نوابوں اور ۲۴؍شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔''

(بقیہ صفحہ ۱۳؍پر)

سچائی کیا ہے؟

(جاری)

بلال عبدالحی حسنی ندوی

زبان کی حفاظت:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِباً أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ.

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کردے۔) (صحیح مسلم:۵)

حدیث شریف میں یہ ایک بہت بنیادی اصول بتایا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جولوگ جھوٹ بولتے ہیں، وہ اسی لیے جھوٹ بولتے ہیں کہ ان کو زیادہ بولنے کی عادت ہوتی ہے، ظاہر ہے آدمی جب زیادہ بولے گا اور ہر سنی سنائی بات نقل کرے گا تو وہ جھوٹ بول ہی جائے گا، بعض مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی آدمی جھوٹ بول جاتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کو تحقیق نہیں ہوتی کہ اس نے کہاں سے کون سی بات سنی ہے، بس وہ نقل کردیتا ہے، حالانکہ وہ بات بالکل خلاف واقعہ ہوتی ہے، جس کے نتیجہ میں بعض مرتبہ بڑے نقصانات سامنے آجاتے ہیں۔

نقل بیانی میں احتیاط:

آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے کہ وہ جو بات سنے اسے نقل کردے۔اس سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات نقل نہیں کرنی چاہیے،اس کے بہت نقصانات ہیں۔ بات بالکل تحقیق والی ہو، سچی بات ہو تو بھی کبھی کبھی ہر بات نقل کردینا انتہائی مضر ہوتا ہے،اس سے دل ٹوٹ جاتے ہیں،مثلاً: کسی مجلس میں کوئی بات ہورہی ہے اور کسی ضرورت کے تحت ہورہی ہے،تو وہ مجلس ایک امانت ہے، سننے والا سن رہا ہے کہ وہاں کسی کے بارے میں ضرورۃً کوئی بات کہی گئی جو بطور غیبت نہیں تھی،تو وہ بات اس مجلس کی حد تک درست ہے،لیکن اگر کوئی اس بات کو لے جاکر باہر نقل کردے،تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بات بننے کے بجائے بگڑے گی،اسی لیے ہر سنی سنائی بات نقل نہیں کرنی چاہیے،خواہ وہ سچی ہی کیوں نہ ہو۔

صحیح بات یہ ہے کہ آدمی کی یہ عادت جب حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ہر طرح کی بات نقل کرتا ہے، اس کو تحقیق نہیں ہوتی، مگر پھر بھی بولے گا کہ فلاں صاحب ایسا کہہ رہے تھے اور اگر خدانخواستہ کسی نے تحقیق کرلی کہ چلو فلاں صاحب سے چل کر معلوم کرتے ہیں، جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ انہوں نے بھی کسی دوسرے فلاں صاحب کا حوالہ دے دیا کہ وہ کہہ رہے تھے اور جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ کوئی اور فلاں صاحب کہہ رہے تھے،اخیر میں معلوم ہوا کہ بات کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی،اسی کو کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلی چوہیا،یعنی بات کا بتنگڑ مگر حقیقت سے خالی۔

غالباً مولانا مسعود علی صاحبؒ یا اور کسی کے بارے میں آتا ہے کہ اگر وہ کوئی ایسی بات سن لیتے کہ فلاں نے ایسا کہا،تو کہتے چلو فلاں کے پاس، پھر اس کے پاس جاتے اور پوچھتے کیا آپ نے ایسا کہا؟ وہ بولتا: نہیں ہم نے تو نہیں کہا مگر ہم نے فلاں سے سنا تھا، کہتے چلو فلاں کے پاس، جب اس کے پاس پہنچتے تو وہ کسی اور کا نام لے دیتا، پھر وہ اس کے پاس ان سب لوگوں کو لے کر پہنچتے اور بات کی تحقیق کرتے، یہاں تک کہ کبھی کبھی پوری جماعت ہوجاتی تھی، پھر جب اخیر میں پہنچتے تو پتہ چلتا کہ بات بہت تھوڑی تھی، ایسے ہی

ایک مجلس میں بات چل رہی تھی، مگر ہم سمجھ نہیں سکے، تو نتیجہ یہ نکلا کہ بات کچھ بھی نہیں تھی، بالکل بے حقیقت تھی۔

ظاہر ہے ہر آدمی اس طرح تحقیق نہیں کرسکتا، یہ تو سخت مشغولیت کا زمانہ ہے، کہاں کسی کو فرصت ہے، کسی کو تحقیق کا موقع نہیں، کسی کے پاس فرصت نہیں، لہٰذا آدمی خود ہی محتاط رہے اور بہتر ہے کہ آدمی کم بولے۔

زبان کی بے احتیاطی کا انجام:

زبان کی حفاظت کا مسئلہ بڑا اہم ہے، حدیثوں میں آتا ہے کہ اکثر لوگ زبان کی وجہ سے جہنم میں داخل کیے جائیں گے، آدمی زبان کو چھوٹا سمجھتا ہے کہ زبان سے فقط ایک بات ہی تو کہی ہے، حالانکہ زبان سے ایک بات ہی کہی ہے مگر غور طلب بات یہ ہے کہ اس بات کا نتیجہ اور اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں؟ نکاح کے موقع پر ہم اکثر یہ بات کہتے ہیں کہ اگر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ زبان سے جو کہتا ہے وہ چھوٹی سی بات ہے، اس کا کوئی نتیجہ نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی حقیقت ہے، تو آپ یہ غور کیجیے کہ نکاح میں کیا ہوتا ہے؟ سب کچھ ہونے کے بعد دولہا صرف ایک جملہ کہتا ہے کہ ''میں نے قبول کیا'' اور یہ کتنا زبردست جملہ ہوتا ہے، گویا اس مختصر سے جملہ سے زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور ایک نئی زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے، ایسے ہی ایک چھوٹا سا جملہ بعض مرتبہ آدمی کہہ دیتا ہے کہ ''جاؤ تم کو ہم نے طلاق دی''، اس میں بھی آدمی نے تھوڑی سی زبان ہی ہلائی ہے اور کچھ نہیں کیا، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان ٹوٹ گئے۔ اسی لیے یہ دلیل ہے کہ آدمی زبان سے جو بات کہتا ہے اس کو بے حقیقت سمجھتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اس کے بڑے گہرے نتائج مرتب ہوتے ہیں، لہٰذا زبان کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

زبان کی بے احتیاطی پر جو سنگین نتائج مرتب ہوتے ہیں، ان کا اندازہ حضرت معاذؓ کی اس حدیث سے ہوتا ہے جس میں ہے:

" ثكلتك أمك يا معاذ! وهل يكب الناس في النار على وجوههم أوقال على مناخرهم إلا حصائد ألسنتهم"(سنن الترمذی: ۲۸۲۵)

(اے معاذ! اللہ تمہارا بھلا کرے، لوگوں کو منہ کے بل آگ میں ان کی زبان کی بک بک ہی تو لے جائے گی۔)

حدیث میں صاف بات ہے کہ جہنم میں اکثر لوگ منہ کے بل اسی زبان کے نتیجہ میں ڈالے جائیں گے اور اس کو آپ ﷺ نے درانتی سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے کھیت کاٹے جاتے ہیں، اسی طرح زبان سے دل کاٹے جاتے ہیں، سماج کاٹا جاتا ہے، محبتیں کاٹی جاتی ہیں، آدمی جب زبان چلانا شروع کرتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ کیا کٹ رہا ہے، جیسے درانتی سے جب کھیت کاٹنا شروع کرتا ہے تو اس کو پتہ نہیں چلتا کہ کتنی گھاس کاٹ دی اور ساتھ ہی ایک آدھ سانپ بھی کٹ گیا، یہ واقعہ ہے کہ گھاس کا مٹھا درانتی سے کاٹنے کے لیے دبایا اور ساتھ ہی سانپ بھی کٹ گیا، تو درانتی سے کیا کٹے گا، کچھ پتہ نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح زبان بھی درانتی کی طرح ہے جو بالکل قینچی کی طرح چلتی ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے آدمی یہ نہیں دیکھتا، بس بولتا چلا جاتا ہے، اسی لیے سب سے بہتر بات یہی ہے کہ آدمی زیادہ تر خاموشی اختیار کرے، حدیث میں بھی ہے:"من صمت نجا"(جو خاموش رہا وہ محفوظ رہا)(ترمذی:۲۶۸۹)

ظاہر ہے جب آدمی زیادہ بولے گا تو الٹا سیدھا ہی بولے گا، لہٰذا زبان کی حفاظت کی جائے، آدمی تول تول کر بولے، جو لوگ زیادہ بولتے ہیں وہی یہ کام کرتے ہیں کہ کہیں کی بات سنی کہیں لگائی اور کہیں کی سن کر کہیں لگائی، ان کو بولنے کا مرض ہوتا ہے، ان کے پیٹ میں کچھ رہتا نہیں ہے، اس کا بڑا نقصان ہوتا ہے، اس لیے اس سلسلہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، کون سی بات کہنے کی ہے اور کون سی بات نہیں کہنے کی ہے اور کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا ہے، اس میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔

نکاح کے چند مسائل (۳)

مفتی راشد حسین ندوی

لڑکی سے اجازت لینا ضروری ہے:

عورت جب عاقلہ بالغہ ہو تو اس کی اجازت کے بغیر ولی باپ بھائی وغیرہ کے لیے بھی اس کا نکاح کرانا جائز نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ثیبہ کا نکاح نہیں کیا جائے گا، یہاں تک کہ قولی صراحت کے ساتھ اس سے اجازت لے لی جائے اور باکرہ کا نکاح نہیں کیا جائے گا، یہاں تک کہ اس کی اجازت لے لی جائے، لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! باکرہ کا اجازت دینا کس طرح ہوگا؟ فرمایا: خاموش رہنے سے۔

(بخاری: ۵۱۳۶، مسلم: ۱۴۱۹، شامی: ۳۲۴/۲)

لڑکی سے اجازت محرم کو لینا چاہیے:

بہتر یہ ہے کہ لڑکی سے نکاح کی اجازت اس کا ولی یا کم از کم کوئی محرم لے، تاکہ اس کا ردعمل (خاموش رہنا، ہلکے آواز میں رونا وغیرہ) دکھ سکے، یہ اجازت عین نکاح ہی کے وقت ضروری نہیں ہے، گھر میں مہمان خواتین کے آنے سے پہلے بھی لی جاسکتی ہے، اگر نامحرم اجازت لیں تو یہ اجازت معتبر ہوگی، اگرچہ یہ بہتر نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے بے پردگی ہوتی ہے۔ (شامی: ۴۹۹/۱)

اجازت لیتے وقت گواہوں کی موجودگی شرط نہیں ہے:

لڑکی سے اجازت لیتے وقت گواہوں کی موجودگی شرط نہیں ہے، البتہ اس اعتبار سے بہتر ہے کہ اگر بعد میں لڑکی اس سے انکار کرے کہ اس سے اجازت لے لی گئی تھی تو ان گواہوں کے ذریعہ اس کو ثابت کیا جاسکے، لیکن اس کے لیے انہی گواہوں کا ہونا ضروری نہیں ہے، جن کو عقد نکاح کے لیے گواہ بنانا ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس وقت گواہ موجود رہیں اور زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ بھی عورت کے محارم میں سے ہوں۔ (ہندیہ: ۲۹۴/۱)

اجازت کا طریقہ:

اگر ولی یا اس کا بھیجا ہوا کوئی شخص باکرہ یعنی کنواری لڑکی کے پاس اجازت لینے کے لیے جائے اور اس سے اجازت مانگے کہ ’’فلاں بن فلاں سے تمہارا نکاح کرا دیا جائے؟‘‘ یا اسی سے ملتے جلتے الفاظ ادا کیے، خواہ مہر کا تذکرہ کرے یا نہ کرے اور لڑکی اس کے جواب میں خاموش رہے یا مسکرا دے یا اس طرح روئے جس کو رخصتی کے غم پر محمول کیا جاسکتا ہو، تو خواہ زبان سے اجازت نہ بھی دے، ان چیزوں کو اجازت کا اشارہ سمجھا جائے گا، چنانچہ اوپر حدیث میں خاموشی کو اجازت پر محمول کیا گیا ہے، لہٰذا ان سب چیزوں کو بھی خاموشی کے درجہ میں مانا جائے گا۔

لیکن اگر لڑکی اس وقت اس طرح بلند آواز سے رونے لگے جس سے سمجھ میں آئے کہ اسے نکاح سے تکلیف ہے تو جب تک وہ صراحت کے ساتھ اجازت نہ دے یا رجسٹر پر دستخط نہ کر دے اس وقت تک اس کو اجازت پر محمول نہیں کریں گے۔

لڑکی اگر ثیبہ (یعنی مطلقہ یا بیوہ) ہو، تو صرف خاموشی کو اس کی اجازت نہیں سمجھا جائے گا، اس کا صراحت سے اجازت دینا ضروری ہوگا جیسا کہ اوپر حدیث میں بتایا گیا ہے۔ (شامی: ۳۲۴/۲)

لڑکی سے اجازت لیے بغیر نکاح:

اگر لڑکی سے اجازت لیے بغیر نکاح کر دیا گیا، تو اگر بعد میں اطلاع ہونے کے بعد اس نے زبانی اجازت دے دی یا زبان سے تو نہیں دی، لیکن رجسٹر پر دستخط کر دیے، یا بغیر کچھ بولے رخصتی کے

لیے تیار ہوگئی تو عقد صحیح ہو جائے گا، لیکن اگر وہ رشتہ سے انکار کردے تو عقد باطل ہوگا۔ (ہندیہ:۱/ ۲۸۷)

نکاح پڑھاتے وقت لڑکی یا اس کے باپ کے نام میں غلطی ہوجانا:

بہتر یہ ہے کہ نکاح پڑھاتے وقت لڑکی کے نام کے ساتھ اس کے والد کا بھی نام لے لیا جائے، تاکہ لڑکی کا اچھی طرح تعارف ہوجائے، لیکن اگر گواہ لڑکی کو جانتے ہوں تو باپ کا نام لیے بغیر بھی نکاح ہوجائے گا۔ (ہندیہ:۱/ ۲۶۸)

اگر لڑکی مجلس نکاح میں موجود نہیں تھی جیسا کہ عام چلن ہے اور قاضی نے ایجاب کراتے وقت لڑکی یا اس کے باپ کے نام میں غلطی کردی تو نکاح منعقد نہیں ہوگا، اس لیے کہ لڑکی یا باپ کے نام میں غلطی کی وجہ سے لڑکی مجہول ہوگئی ہے اور اگر لڑکی مجلس نکاح میں موجود تھی اور لڑکی یا اس کے باپ کے نام میں غلطی ہوگئی، لیکن قاضی نے لڑکی کی طرف اشارہ کرکے ایجاب کرایا تو نکاح منعقد ہوجائے گا (شامی:۲/ ۲۹۸)

جس لڑکی کے دو نام ہوں:

اگر کسی لڑکی کا نام بچپن میں کچھ اور رکھا گیا، پھر بعد میں بدل کر کچھ اور رکھا گیا تو اصح یہ ہے کہ دونوں نام سے ایجاب کیا جائے، لیکن ایک نام لینا ہو تو دوسرا نام اگر معروف ہوگیا ہو تو اسی کو لیا جائے، اگر پہلا والا ہی زیادہ معروف ہو تو پہلا لیا جائے۔(ہندیہ:۱/ ۲۶۹)

دو بہنوں کا ایک ساتھ نکاح اور نام میں غلطی:

دو بہنوں کا ایک ساتھ الگ الگ لڑکوں سے نکاح کرنا تھا، ہر لڑکے کا جس بہن سے نکاح طے تھا، اسی لڑکے کا نام لے کر اجازت لی گئی، لیکن مجلس نکاح میں قاضی نے غلطی کردی اور ایجاب کرتے وقت جس سے نکاح ہونا تھا اس لڑکی کے بجائے دوسری لڑکی کا نام لے لیا تو یہ نکاح منعقد نہیں ہوگا، بلکہ نکاح فضولی کے درجہ میں ہوگا، اس لیے کہ لڑکی نے جس لڑکے سے نکاح کی اجازت دی تھی اس سے اس کا نکاح نہیں کرایا گیا، لہٰذا اگر جس سے رشتہ طے تھا اسی سے نکاح کرانا ہے تو دونوں لڑکیوں سے کہلوادیا جائے کہ جس سے نکاح پڑھایا گیا اس سے نکاح پر وہ راضی نہیں ہیں، پھر جن سے رشتہ طے تھا ان سے نکاح پڑھا دیا جائے اور اگر لڑکی لڑکا اور دونوں کے گھر والے اس پر راضی ہیں کہ جس سے نکاح پڑھایا گیا ہے اس سے رشتہ قائم رکھنے میں کوئی حرج نہیں تو اگر غلطی سے جس لڑکے سے ایجاب ہوگیا تھا بعد میں لڑکی سے اس کی اجازت لے لی جائے یا اس کی رخصتی اس کے یہاں اس کی رضامندی کے ساتھ کرا دی جائے تو اب فضولی کی حیثیت سے کرایا ہوا نکاح مکمل طور سے ہوجائے گا۔

اور اگر رخصتی پہلے سے طے شدہ رشتہ کے موافق کرالی گئی، لیکن اوپر بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق لڑکی سے انکار کرا کے از سر نو ایجاب وقبول نہیں کرایا گیا، تو یہ رخصتی درست نہیں ہوئی، دونوں سے کہا جائے کہ فوراً الگ الگ ہوں اور پھر سے نکاح کریں۔

(ہندیہ:۱/ ۲۹۹، کتاب المسائل:۴/ ۱۰۵)

نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح:

شرعاً نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح جائز ہے اور اگر نابالغی کی حالت میں ان کا نکاح کرنا ہے تو ایجاب وقبول ان کی طرف سے ان کا ولی کرے گا، اگر کوئی لڑکی یا لڑکا بالغ ہو لیکن مجنون ہو تو اس کا حکم بھی نابالغ کا ہے۔ (شامی:۲/ ۳۲۱)

بالغہ لڑکی کا اجازت کے بعد انکار:

اگر ولی، اس کے وکیل یا فرستادہ نے لڑکی سے اجازت طلب کی اور اس نے صراحت سے یا خاموش رہ کر اجازت دے دی، تو یہ ایک طرف کی توکیل ہے، لہٰذا اگر بعد میں اس نے اجازت سے رجوع کرلیا اور رشتہ سے انکار کردیا، لیکن اس کے انکار کا ولی کو پتہ نہیں چلا اور اس نے نکاح کروادیا تو یہ نکاح منعقد ہوجائے گا، لیکن اگر نکاح کروانے سے پہلے ولی کو لڑکی کے انکار کا پتہ چل جائے تو اسے نکاح کرانے کا اختیار ختم ہوجائے گا، گویا اسے وکالت سے معزول کردیا گیا ہے لہٰذا اگر وہ نکاح کرا بھی دے تو منعقد نہیں ہوگا۔

(شامی:۲/ ۳۲۴-۳۲۵)

غیر متعلق اجازت لے اور لڑکی خاموش رہے:

اوپر بتایا گیا کہ اگر ولی یا اس کا بھیجا ہوا شخص کنواری لڑکی سے اجازت طلب کرے اور وہ خاموش رہے، تو یہ اس کی اجازت کی دلیل ہے، حدیث میں صراحت کے ساتھ اس کو اجازت قرار دیا گیا ہے، لیکن اگر ولی کے علاوہ کوئی غیر متعلق شخص خواہ وہ دور کا ولی ہی کیوں نہ ہو، اس سے اجازت طلب کرے تو صرف اس کا خاموش رہنا اجازت کی دلیل نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی بات کی پرواہ نہ کرنے کی وجہ سے خاموش ہو، لہٰذا ان کے اجازت طلب کرنے پر اجازت اسی وقت سمجھی جائے گی، جب وہ صراحت سے رضامندی کا اظہار کردے، یا دلالۃً اس کی رضامندی والی کوئی بات پائی جائے، مثلا: مہر قبول کرلے یا وطی پر قدرت دے دے۔ (شامی:۲/ ۳۲۶-۳۲۷)

جہاں تک ثیبہ کا تعلق ہے تو اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ اس کی خاموشی رضامندی نہیں مانی جائے گی، یا وہ صراحت سے اجازت دے، یا ایسا کوئی قرینہ پایا جائے جو رضامندی پر دلالت کرتا ہو، مثلا: مہر قبول کرنا وغیرہ۔ (شامی:۲/ ۳۲۷)

کنواری لڑکی کون ہے:

یہاں کنواری سے مراد وہ لڑکی ہے جس کی پہلے شادی نہ ہوئی ہو خواہ حقیقت میں کسی وجہ سے (مثلاً: اچھلنے کودنے یا عمر زیادہ ہوجانے جیسی کسی چیز کی وجہ سے) اس کا پردۂ بکارت زائل ہوگیا ہو، اسی طرح اگر کسی عورت کا پردہ بکارت زنا کے سبب زائل ہوگیا تو وہ بھی باکرہ کے حکم میں ہوگی، الا یہ کہ زنا کی بہت زیادہ شہرت ہوگئی ہو! (ہندیہ:۱/ ۲۹۰)

کسی شرط پر نکاح:

نکاح کو کسی شرط پر معلق کرکے کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی شرط پر معلق کیا تو اگر وہ ایسی شرط ہو کہ پائی بھی جاسکتی ہو اور نہ بھی پائی جاسکتی ہو، مثلاً: کہے کہ اگر فلاں راضی ہوا تو میں نے نکاح کیا یا قبول کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا اور گزرے ہوئے کسی فعل پر معلق کرکے نکاح کیا جو یقینی طور پر پیش آچکا تھا تو نکاح ہوجائے گا۔
(شامی:۲/ ۳۲۰)

بقیہ: یوم آزادی کا پیغام

اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا سب سے نمایاں حصہ رہا ہے اور انہوں نے اس میں پیش قدمی بھی کی ہے اور چونکہ ہر دور میں مسلمان ہر نئے قدم کے لیے علماء کی طرف دیکھتے رہے ہیں اور ان کے اشارۂ انگشت میں اپنے لیے دین ودنیا کی بھلائی تصور کی ہے، اس لیے ان کی ہر تحریک کا رشتہ علماء ہی سے جاکر جڑتا ہے۔

سلامتی ہو ان مجاہدین آزادی پر، ان کی روحوں پر، ان کی خواب گاہوں پر کہ ان کی شہادت کے خون ولہو کی سرخی نے آج ان کے وطن کو لالہ زار بنادیا ہے، غلامی کی زنجیریں کٹ چکی ہیں، غیر ملکی بادشاہت کے آہنی لباس تار تار ہوچکے ہیں، ان میں کچھ نے اپنی آنکھوں کو اس آزادی سے ٹھنڈا کیا ہے، کچھ حسرتوں کے ساتھ خدا کے ہاں پہلے ہی چلے گئے، کچھ کے نام تاریخ کے صفحات نے یاد رکھے ہیں اور کتنے ہی ہیں کہ خدا کے سوا ان کی قربانیوں، فداکاریوں اور جانبازیوں کو کوئی نہیں جانتا۔

ہم فرزندان وطن کا فرض ہے کہ آزادی کے اس چراغ کو روشن رکھنے کی کوشش کریں، ہم ذات پات، مذہب و برادری اور زبان کی سطح سے اوپر اٹھ کر ایک سچے اور ایماندار ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیں، یہاں اقلیتیں خود کو محفوظ باور کریں، اکثریت اور اقلیت کے لیے انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، وہ مزدور کہ بلندو بالا عمارتیں، سرسبز وشاداب باغات، خوبصورت نہریں اور صاف وشفاف سڑکیں سب انہی کے پسینوں کی رہین منت ہیں، ان کو ان کا حق ملے اور ہر گھر میں مسرت وخوش حالی اور انصاف کا چراغ جل سکے، وہ آزادی جو دلوں کو سکون دے، جو امتیاز وتفریق کی دیواروں کو ڈھادے، جو بلند وبالا عمارتوں میں رہنے والوں میں بھی غریبوں کی جھونپڑیوں سے محبت پیدا کردے، جہاں مذہب نفرت کی بنیاد نہ ہو، بلکہ مختلف مذاہب کی رنگارنگی اس کو گلدستہ کا مصداق بنادے کہ:

گل ہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن

خالق حقیقی کا نظام ارض وسماں

عبدالسبحان ناخدا ندوی

آسمان کی بے داغ بناوٹ، اس کی بے عیب سجاوٹ، اس کی دل کشی، اس کا بے مثال نظام، اس کی اونچائی، اس کی وسعت، اس کے چاند سورج، اس کے ستارے وسیارے، اس کا نظام شمسی، اس کی کہکشائیں، غرض پورا فلکی نظام، اس کا جماؤ، اس کا کساؤ، اس کا انتہائی حیرت انگیز حسابی نظام کہ ہزاروں لاکھوں سالوں سے ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں، کوئی دل پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ یہ سب خود بخود وجود میں آیا ہے؟ انسان جب تک ''خود بخودٗ'' کے اندھے کنوئیں سے باہر نہیں نکلے گا، تب تک اس میں نظام کائنات میں غور وفکر کرنے کی سمجھ کیسے آئے گی؟ آسمان قرآنی شہادت کے مطابق مضبوط بناوٹ پر مبنی اللہ کی مخلوق ہے، پھر بھی یہ مان لیا جائے کہ ہماری نظروں کی آخری رسائی ہے، تب بھی اس میں کوئی جھول، کوئی خول، کوئی رخنہ، کوئی شگاف، کوئی چھید، کوئی دراز، کوئی پیوند، کوئی ترمیم، کوئی اینچ پیچ، کوئی ناہمواری ہزاروں لاکھوں سالوں میں ایک دفعہ بھی کیوں پیدا نہیں ہوئی یا کیوں نظر نہیں آئی؟ سچی بات یہ ہے کہ غور کرنے والوں کے لیے تنہا یہی ایک شہادت اللہ کی وحدانیت اور اس کے کامل تصرف کی طرف سے جاننے کے لیے کافی ہے، ایسا نظام نہ بے خدا چل سکتا ہے، نہ بہت سارے خدا مل کر ایسا مربوط نظام وضع کر سکتے ہیں، جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے یوں ملی ہوئی ہے کہ پورا نظام ارضی وفلکی ایک وحدت نظر آتا ہے۔

زمین، اس کا پھیلاؤ، اس کی وسعت، اس کی ہمواری، اس میں چلنے پھرنے کی آسانی، جوتنے بونے کی صلاحیت، نہ اتنی سخت کہ کھودا نہ جا سکے، نہ اتنی نرم کہ پاؤں دھنسنے لگیں، اس کی ہر چیز عین انسانی فطرت کے مطابق، اس کی ہر نعمت انسانی ضرورت کے عین مناسب، یہ سب کوئی بتائے کہ یہ سب اپنے آپ وجود میں آ گیا یا ایک خالق کی خلاقیت، ایک صانع کی صناعی اور ایک حاکم کی حکومت اور ایک قادر کی قدرت کے جلوے ہیں جو ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں؟ زمین، اس کے پہاڑ، اس کے سمندر، اس کے عظیم صحراء، اس کے نشیبی حصے، اس کے بالائی ٹکڑے، اس کی آبادی کا پھیلاؤ، اس میں موجود خزانے جو عین انسانی ضرورت کے مطابق ہیں، انسانی آبادی کے تناسب سے ہونے والی انسانی ترقیاں، انسانی حوصلوں اور زمینی خزانوں کے درمیان پایا جانے والا انتہائی حسین ربط، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انسانی حوصلہ مندیوں کی تکمیل سے زمین کے خزانے عاجز ہوئے اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ زمینی بے پناہ ذرائع وخزانوں سے فائدہ اٹھانے سے انسان عاجز رہا، جس وقت جس چیز یا جس ترقی کی ضرورت انسانی کل آبادی نے محسوس کی، زمین میں اس ضرورت کی تکمیل کا سامان نظر آیا اور انسانی قابلیت بھی علم وفن اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ اسی قدر بڑھا دی گئی، کیا غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں ہے؟ دسیوں ہزار سال سے کروڑوں اربوں انسان اس زمین سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور آج تک اس کے خزانہ خالی نہیں ہوئے، جب کہ دوسرے سیاروں کا حال یہ ہے کہ وہاں ابھی تک زندگی کے آثار بھی باوجود کوششوں کے دریافت نہیں کیے جا سکے، کیا یہ ساری چیزیں الل ٹپ خود بخود وجود میں آ گئیں کہ بس ایک دھما کہ ہو گیا جس نے تمام انسانی فطری تقاضوں کی تکمیل کر ڈالی، آخر اتنی سمجھ بھی انسانوں کو نہیں آتی کہ دھماکے ترتیب بگاڑتے ہیں، بناتے نہیں ہیں، یہ سب ایک پیدا کرنے والے کا کرشمہ ہے، جس نے اپنی مخلوق کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھا:

﴿وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَتَ اللّهِ لاَ تُحْصُوهَا إِنَّ الإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾ (تم نے جو مانگا اس نے

وہ سب تمہیں دیا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ان کو اپنے احاطے میں نہیں لے سکتے، واقعی انسان کتنا ظالم اور کیسا ناشکرا ہے)

بعض مشرک قوموں نے آسمان وزمین ہی کو دیوتا بنا دیا، غور کرنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک خالق کی بنائی ہوئی مخلوق ہے جو مسلسل اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، کہنے والے نے سچ کہا: اس نظام عالم میں آکاش دیوتا اور دھرتی ماتا کی کوئی گنجائش نہیں، نہ اس میں الحاد و دہریت کی حماقت سما سکتی ہے، نہ شرک و کفر کی غلاظت کے لیے اس میں کوئی جگہ ہے، اس پورے نظام کائنات کا ایک اور صرف ایک خدا ہے: "لا الہ الا اللّٰہ" (اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں کوئی الہ نہیں، کوئی رب نہیں، کوئی حاکم وخالق نہیں) بس سننے والے کان چاہئیں!

رات دن کا اختلاف کہ ایک سراپا تاریکی، دوسرا مجسم نور وروشنی، رات کی تاریکی اپنے اندر سکون وآرام کے خزانے رکھتی ہے اور دن کا اجالا اپنی فطرت کے لحاظ سے کام اور جدوجہد کا تقاضا پیدا کرتا ہے، یہی عین انسانی فطرت ہے، کام پھر آرام پھر کام پھر آرام، ہزاروں سال ہوئے نہ انسانی فطرت میں تبدیلی ہوئی، نہ رات دن کے نظام میں کوئی فرق آیا، شب و روز کی گردش کے ساتھ انسانی فطرت کی ہم آہنگی کیا خود بخود وجود میں آئی؟ غور کیا جائے کس نظام کا حسب معمول جاری ہونا اس کے معمولی ہونے کی دلیل نہیں ہے؟ قدرت کے کرشموں کو غور سے دیکھا جائے تو یہاں ہر حسب معمول چیز اس قدر غیر معمولی وعظیم ہے کہ انسانی عقل مجسم حیرت بن جائے، رات و دن کی قدر و قیمت ان لوگوں سے پوچھی جائے جہاں کئی کئی مہینوں تک رات پھر کئی مہینوں تک دن رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہی سوال قائم کر کے انسانوں پر اپنا احسان جتایا ہے:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَداً إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ☆ وَمِن رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (کہیے: تمہارا کیا خیال ہے اگر اللہ تعالیٰ تم پر رات کو قیام کے دن تک ہمیشہ کے لیے مقرر کردے، تو اللہ کے علاوہ کون معبود ہے، جو تمہارے پاس روشنی لے آئے، کیا تم سنتے نہیں ہو، آپ کہیے: تمہارا کیا خیال ہے اگر اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ہمیشہ کے واسطے قیامت کے دن تک دن ہی دن بنا دے تو اللہ کے علاوہ کون معبود ہے جو تمہیں ایسی رات فراہم کرے جس میں تم سکون حاصل کرو، کیا تم دیکھتے نہیں ہو یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے تمہارے لیے رات دن بنائے تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرسکو اور اس میں اللہ کے فضل کو تلاش کرسکو تا کہ اللہ کا شکر ادا کرسکو)

اللہ کا یہ بھی ایک بے پناہ احسان ہے کہ اس نے کشتیوں کو سمندر میں تیرنے کی کیفیت عطا کی، اگر اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پانی میں ڈبو دینے والی بناتا، تو یہ ہزاروں میل وسیع وعریض سمندر انسانوں کے لیے برائے نام کام آتا، لیکن ان جہازوں اور کشتیوں کے ذریعہ انسان لگ بھگ سمندر کے بہت بڑے حصہ سے فائدہ اٹھاتا ہے، تجارتیں ان ہی سے قائم ہیں، سمندر میں موجود موتی اور مونگے، اس کے ساتھ ساتھ سامان آرائش سب سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے، بالخصوص سمندری سفر اور تجارت اس کے لیے آسان بنائے گا، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر طرح کا سامان ہر جگہ پہنچایا جاتا ہے، جس سے لوگ بہت فائدہ اٹھاتے ہیں، ورنہ ایک سامان بے ضرورت ایک ہی جگہ پڑا رہتا اور دوسری طرف ضرورت مند لوگ محروم رہ جاتے۔

اللہ نے وہ چیزیں بھی عنایت کیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں، اس میں مرچ مسالوں سے لے کر ضرورت کی بڑی سے بڑی چیز آگئی، نفع رسانی میں آسمان سمندر اور جہازوں کا کردار فراموش نہیں کیا جاسکتا، اللہ کے علاوہ ہے کون جس نے ہزاروں ٹن وزنی جہاز کو سمندر پر رواں دواں کردیا، جب کہ ایک معمولی کنکر بھی اس میں ڈوب جاتا ہے، دوسرے یہ کہ خشکی کے سفر میں انسان یا جانور کو خود چلنا پڑتا ہے، جب کہ سمندری سفر میں بادبانی کشتیوں کو ہوا کے خاص رخ پر کردینا کافی ہوتا ہے، پھر وہ خود ہی پانی پر چلنے لگتی ہے، الگ سے مزید محنت کی ضرورت نہیں رہتی، اس میں قدرت کا کرشمہ اور زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے، ورنہ خشکی کا سفر بھی اللہ ہی کی نعمت

ہے، لیکن اللہ نے مثال سمندر کے سفر کی دی ہے، اس میں انسانی محنت خشکی کے مقابلہ میں بہت کم اور اللہ کا فضل بے حد نمایاں نظر آتا ہے، ویسے ہر چیز اللہ کے فضل سے ہوتی ہے۔

اللہ نے قرآن مجید میں بارش کے پانی کو مبارک فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكاً﴾

(ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا)

جو چیز اپنے اندر بہت خیر و بھلائی رکھے، اسے مبارک کہتے ہیں، بارش کے پانی سے انسان اور جانور دونوں سیراب ہوتے ہیں، اس سے چارہ وغلہ اگتا ہے جو انسان اور جانور دونوں کی بھوک مٹاتا ہے، گویا یہ مبارک پانی انسان وحیوان دونوں کی بھوک و پیاس مٹانے کے کام آتا ہے، جانوروں کے سیراب ہونے سے، ان کے تھن دودھ سے بھر جاتے ہیں، جو انسانوں کی غذا کا اہم ترین عنصر ہے، اس سے خود جانور بھی فربہ ہوتے ہیں، جانور خود بھی انسانی غذا ہیں، اسی سے جانوروں میں طاقت وقوت آتی ہے، اس کے ذریعہ بہت ساری انسانی ضروریات پوری ہوتی ہیں، جانور فربہ وطاقتور ہو تو اس پر سفر آسان ہوتا ہے، ورنہ سفر مشکل ہو کر رہ جائے، نزول قرآن کے وقت نقل وحمل اور آمد ورفت کا ذریعہ جانور ہی تھے۔

اسی بارش سے زمین لہلہا اٹھتی ہے اور پوری زمین پر حسین سبزہ کی چادر بچھ جاتی ہے، یہ منظر انسانی جمالیاتی حس کی تسکین کرتا ہے، بارش قطرات کی شکل میں انتہائی دلکش طریقہ سے برستی ہے، ورنہ منوں ٹنوں بادل یکبارگی پھٹ پڑے تو پتہ نہیں کتنی تباہی مچ جائے، بارش سے پہلے خوشگوار ہوائیں انسانی طبیعت کو کیف وانبساط سے معمور کرتی ہیں، اس زمانہ کے لحاظ سے دیکھیں تو یہی پانی بڑے بڑے ڈیم میں محفوظ رکھا جاتا ہے، جس سے حسب ضرورت فائدہ اٹھایا جاتا ہے، بجلی کی فراہمی میں بھی بارش کا انتہائی عمل دخل ہے، اسی پانی کو خاص سطح پر اسٹور کر کے پوری قوت کے ساتھ نیچے بہایا جاتا ہے، جس سے بجلی کی توانائی حاصل کی جاتی ہے، اسی توانائی سے آج قریہ قریہ روشن ہے، یہی پانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی شکل میں محفوظ رہتا ہے، پھر وہیں سے انتہائی صاف وشفاف پینے کا پانی مہیا ہوتا ہے، بہرحال یہ انتہائی بابرکت نہایت مفید پانی ہے جس سے ہزاروں سال سے انسان فیضیاب ہوتا آیا ہے، لیکن شکر ادا کرنے کا خیال کم ہی انسانوں کو آتا ہے۔

ہوائیں بھی اللہ رب العزت کی ایک عظیم نشانی ہیں، ہواؤں کا چلانا، کبھی گرم، کبھی ٹھنڈی، کبھی پر لطف وفرحت بخش، کبھی تیز وتند خوف پیدا کرنے والی، کبھی پھل پھول میں زندگی کی لہر دوڑانے والی، کبھی خشک اجاڑ بانجھ کر دینے والی، کبھی بارشیں لا کر انسانوں کو بے حد فائدہ پہنچانے والی، کبھی طوفانی رفتار سے چل کر ہر چیز کو تہہ وبالا کرنے والی، یہ ہوائیں اپنے اندر اللہ کی رحمت، قدرت، عذاب اور ربوبیت کی نشانیاں رکھتی ہیں۔

اسی طرح بادل جو آسمان وزمین کے درمیان کام میں لگا دیے گئے ہیں، بادلوں کا معاملہ بھی نہایت حیرت انگیز ہے، ان کے بنانے بھیجنے اور برسنے میں انسانی محنت ایک فیصد بھی نہیں ہوتی، لیکن انسانوں کے کام آنے میں ان کی حیثیت بہت بڑھی ہوئی ہے، سمندر کے انتہائی نمکین پانی سے ابخرات اٹھتے ہیں، باہم مجتمع ہو کر بادلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں، ہزاروں ٹن وزنی بادلوں کو ہلکی پھلکی ہوائیں سینکڑوں ہزاروں میل دور لے جاتی ہیں، پھر خاص قسم کی ٹھنڈک اور ہوا کا دباؤ پا کر وہ آہستہ آہستہ پگھلتے ہیں اور قطرات کی شکل میں برس کر ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان اور جانوروں کی سیرابی بلکہ زندگی ومعاش کا سامان بنتے ہیں، مردہ زمین اس سے جی اٹھتی ہے اور زمین پر انسان کو آباد رکھنے کا نظام قائم رہتا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوراً ☆لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَّيْتاً وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَاماً وَأَنَاسِيَّ كَثِيراً﴾

(ہم نے آسمان سے پاک وصاف پانی اتارا تاکہ اس پانی سے مردہ بستی کو زندہ کریں اور اپنی مخلوقات میں بہت سارے جانوروں اور بہت سارے انسانوں کو اس سے سیراب کریں)

محمد ارمغان بدایونی ندوی

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

بحیثیت اردو ادیب

''آپ کے جامع، فکر انگیز اور دل نشیں لب ولہجہ و پیرایہ بیان سے نئے افق سامنے آتے ہیں۔'' (پروفیسر رشید احمد صدیقی)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ آسمان علم وادب کا ایک درخشندہ ستارہ اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی جبیں کا نور ہیں، جن کی شخصیت باعث عزو افتخار ہے، آپ بجا طور پر فکر اسلامی کے عالمی قائد ورہبر، تربیت اسلامی کے قافلہ سالار اور ثقافت اسلامی کے میر کارواں تھے، مولاناؒ زبان وقلم کے ایک کامیاب غازی تھے، جن کی خدمات کا دائرہ نہایت متنوع ہے۔

ابتدائی زمانہ میں حضرت مولاناؒ کو ہر چھپی ہوئی چیز پڑھنے کا شوق تھا' اس وقت آپ نے متعدد اردو ادباء کی تحریریں اس طرح پڑھیں کہ جذب کر لیں، مثلاً: نیرنگ خیال اور آب حیات، اسی طرح علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی تحریریں نیز الہلال کے اداریوں کا بھی ذوق وشوق سے مطالعہ کیا، جس کے متعلق خود حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں کہ

''ان (مولانا آزادؒ) کے زور قلم اور جوش بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا۔'' (کاروان زندگی: ۱/۹۵)

حضرت مولاناؒ کا اردو زبان وادب کا مطالعہ وسیع اور متنوع تھا، تاہم ان کے مزاج ومذاق پر کسی ادیب کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا، تاہم وہ اپنے ابتدائی عہد کے متعلق خود فرماتے ہیں کہ

''بہت دنوں تک ''نیرنگ خیال'' اور ''آب حیات'' کی تقلید میں بہت سے صفحات سیاہ کیے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہ رہے۔'' (کاروان زندگی: ۱/۹۵)

اسی طرح حضرت مولانا اپنے ابتدائی مضمون نگاری کے عہد سے متعلق فرماتے ہیں کہ

''اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب ''یاد ایام'' کا تھا جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے۔'' (ایضا: ۱/۹۶)

حضرت مولاناؒ نے گرچہ ادب وانشاء کو ایک پیشے یا ذریعہ اظہار وخیال کے طور پر منتخب نہیں کیا، تاہم اردو ادب اور فن تاریخ وتنقید میں انہیں کامل دست گاہ حاصل تھی، حضرت مولاناؒ کے والد کی مشہور کتاب ''گل رعنا'' پر آپ کا فاضلانہ مقدمہ اس ذوق کا شاہ کار ہے۔

حضرت مولاناؒ نے ادب کے دائرہ اور حدود کو وسعت دی نیز اسلامی ادب کو آفاقیت بھی بخشی، وہ زبان وادب کو محض ایک پیشہ یا پیشہ ور لوگوں کی جاگیر سمجھنے کے سخت مخالف تھے، جس کا ثبوت ان کی زندہ جاوید تحریریں وتقریریں ہیں، جو علم وادب کا مخزن ہیں اور فطری وادبی ذوق کے ساتھ انشاء پردازی کے خداداد ملکہ کا ثبوت بھی، یہی وجہ ہے کہ اگر وہ کسی خشک موضوع پر بھی خامہ فرسائی کرتے تو اسے شگفتہ اور بہار آفریں بنا دیتے، مولانا کا اسلوب بیان دردمندی، فکر سوزی، دل نشینی اور جاذبیت کا ایک نایاب نمونہ ہے۔

حضرت مولاناؒ کی تمام تر تگ ودو کا محور دعوت اسلامی تھا، ان کی ہر تحریر وتقریر علم نافع اور ایمان واسع کی داعی ہے، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ حقیقی معنی میں زبان وادب کے کوچہ سے آشنا تھے اور ذوق سلیم سے بہرہ ور تھے، دراصل ان کی نشو ونما خالص دیندار ماحول میں ہونے کے ساتھ ایک ادبی فضا میں ہوئی اور ان کی پرورش اصحاب فضل وکمال کی آغوش میں ہوئی جنہیں باطنی صفات میں رسوخ تھا اور ادب وانشاء کا اعلیٰ مذاق بھی حاصل تھا، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے خاندانی ذخیرۂ کتب میں زبان وادب کی معیاری ووقیع کتابیں موجود تھیں، جن کے مطالعہ نے دماغ کو صیقل

کردیا اور ان سے اشتغال نے ایک صاحب طرز ادیب بنادیا، مگر انہوں نے اپنے اس اعلیٰ ذوق کو دعوت اسلامی کی تبلیغ کے لیے وقف کردیا اور دعوتی وفکری عنصر کو ادب وانشاء پردازی پر حاوی رکھا، تاہم ایک داعی کے لیے اس کی اہمیت وضرورت کا ہمیشہ اعتراف کیا، جس کے بغیر دعوت کی اسپرٹ پیدا نہیں ہوتی، وہ اپنی سوانح میں اردو زبان وادب کے مطالعاتی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’دین کے جن داعیوں اور علماء کو آغاز عمر میں اپنے ملک کی زبان وادب کے مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا، یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کو دین کی مؤثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم وتعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دینی مقاصد کو دل نشین کرنے میں دقت پیش آتی ہے اور ان کی انشاء وتحریر میں وہ طاقت اور دل آویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے۔‘‘ (کاروان زندگی: ۱/۹۴)

حضرت مولاناؒ مصنوعی اور پر تکلف انشاء وادب کے کبھی قائل نہ تھے، بلکہ وہ بامقصد ادب، زبان کے صحیح استعمال، طاقتور انشاء، خیالات وجذبات کے اظہار اور حقیقی انسانی تاثرات واحساسات کی تصویر کشی کے داعی تھے، اسی لیے تاریخ میں جن لوگوں کا محض ادب سے اشتغال نہیں رہا، بلکہ انہوں نے سماجی، اصلاحی، اخلاقی اور تربیتی میدان میں طالع آزمائی کی، حضرت مولاناؒ نے ان سب بلند پایہ مصنفین کو ادباء کی صف اول میں شمار کیا ہے اور زمانہ کی ستم ظریفی کا بڑے متاسف اور دردمند لہجہ میں یوں اظہار فرمایا ہے:

’’ان بے گناہوں کا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ادب وانشاء کو اپنا مستقل پیشہ یا اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بنایا اور ان کی اکثر تحریروں کا موضوع دینی یا علمی ہے۔‘‘

(تاریخ دعوت وعزیمت: ۳/۲۴۱)

رابطہ ادب اسلامی جس کے صدر حضرت مولاناؒ ہی تھے، اس کے قیام کا ایک بنیادی مقصد یہی تھا کہ علماء ودانشوران مقامی زبانوں پر عبور حاصل کریں اور ان کی سنجیدہ دعوتی واصلاحی تخلیقات کو ادب وانشاء کے دل آویز نمونوں کا مرقع سمجھا جائے اور ایک عالمی پلیٹ فارم سے اس بات کی تشہیر ہو کہ ادب کا دائرہ تنگ نہیں ہے اور ادب مصنوعی زندگی، روح سے محروم اور تاثیر سے خالی انشاء پردازی کا نام بھی نہیں ہے، جیسا کہ عموماً زبان وادب کے ماہرین سمجھتے ہیں۔

سیرت وسوانح حضرت مولانا کا پسندیدہ موضوع تھا، جو خیال کی رعنائی اور قلم کی جولانی سے خالی نہ تھا، اسی لیے انہوں نے اپنی طرز نگارش سے شخصیات کی معنوی خصوصیات کی مصوری بھی کی ہے، جس سے ان کا ادبی مذاق اور طبیعت کی لطافت کا ثبوت ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا کا منفرد اسلوب کہیں بھی قلم کی گل کاری وگل فشانی سے باز نہیں رہتا، بلکہ ان کی ہر تحریر شستگی وشگفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہے، مولانا ظفر علی خاں کا تعارف ان کے اشہب قلم سے یوں نکلتا ہے:

’’مولانا ظفر علی خاں رزم وبزم کے آدمی تھے، آج یہاں شیر کی طرح گرج رہے ہیں، کل وہاں بلبل کی طرح چہک رہے ہیں، کبھی جیل میں ہیں، کبھی کسی تنظیم کے قائد، اردو شاعری تو ان کے گھر کی لونڈی تھی، اردو نے عرصہ سے ایسا قادر الکلام شاعر پیدا نہیں کیا ہوگا، قوافی کے تو وہ بادشاہ تھے۔‘‘ (پرانے چراغ: ۲/۱۷۱-۱۷۲)

مولانا آزاد کے متعلق آپ نے برجستہ جو بلند الفاظ تحریر کیے ہیں، ان سے آپ کی زباں دانی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی وہ الفاظ خود آپ کی جہد مسلسل پر بھی صادق آتے ہیں، ملاحظہ ہو:

’’تاریخ وتصنیف کی بادیہ پیمائی، سیاست کے ہفت خواں کو طے کرنے سے بہت مختلف ہے، اول الذکر کے لیے فراغ خاطر، حالات کا اعتدال اور علمی ماحول ضروری ہے اور سیاست کے بیڑے کو طوفانوں اور آندھیوں سے مفر نہیں، ان ناہموار حالات اور طوفانی موسم میں بھی مولانا آزاد نے جتنا کام کرلیا اور جو نقوش چھوڑے وہ ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور غیر معمولی قوتِ ارادی کی دلیل ہے۔‘‘

(پرانے چراغ: ۲/۱۷۹)

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ جس اسلوب کے بانی وخاتم تھے، وہ دراصل قرآن مجید کے حقیقت کیش اسلوب کی صاف جھلک تھی، جس میں ہر جگہ جذبات وتعقل کا حسین امتزاج کھلا نظر آتا ہے۔

اسلام اور انسانیت کی مسیحائی

محمد نفیس خاں ندوی

جب ہر قسم کے ذرائع اور مواقع حاصل ہوں، نہ چوکیدار ہو نہ تھانے دار، نہ کوئی دیکھنے والا ہو نہ کوئی ٹوکنے والا، جب چوری، گناہ، قتل یا حق تلفی کرنا ممکن وآسان ہو مگر انسان کے اندر کی کیفیت اس کا ہاتھ پکڑ لے اور وہ اُس جرم سے باز رہے، اسی کیفیت کا نام ہے انسانیت!

آج انسانوں کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے، ترقیات کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔ بجلی، ہوائی جہاز، انٹرنیٹ، ایٹم بم وغیرہ سے انسانوں کی عظیم ترقی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن! انسانیت کی ترقی ان مادی ترقیات کا نام نہیں ہے، انسانیت کی ترقی کا اندازہ ہماری زندگی کے سانچوں یا مادی پیمانوں سے نہیں کیا جاسکتا، اس کا اندازہ انسانوں کے اخلاق وکردار اور ان کے افکار ونظریات سے کیا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارے چاروں طرف زندگی کا جو طوفان امڈا ہوا ہے اس میں کسی کو انسانیت کا احساس نہیں، اللہ نے انسانوں کو صرف ایک معدہ اور پیٹ ہی نہیں دیا بلکہ اس کو ایک روح اور دل بھی عطا کیا ہے جسے جنسی خواہشات اور مادیت کے ریلے میں فراموش کر دیا گیا ہے۔

سیاسی اختلافات اور نظام سلطنت تو فرصت کی باتیں ہیں، اقتدار پر قبضہ خواہ کسی پارٹی کا ہو، خواہ کوئی صدر یا وزیر ہو، حقیقی حکمرانی تو نفس کی ہے اور حقیقی تسلط خواہشات کا ہے۔ وقت کا فرمان ہے کہ نفس کی خواہش پوری کی جائے، دل کی آگ بجھائی جائے، خواہ انسانوں کے خون کی نہریں بہیں، لاشوں کو روندنا پڑے یا ملک کے ملک ویران وتباہ ہو جائیں۔

انسانوں کی اتنی بڑی آبادی میں انسانیت کی آواز کہیں سے سنائی نہیں دیتی، اور اگر کسی کو انسانیت کے انحطاط کا احساس بھی ہے تو اس کے اندر اتنی جرأت نہیں کہ وہ آواز اٹھا سکے، پورے پورے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو انسانیت کے لیے قربانیاں دے سکے۔ دراصل یہ جرأت صرف پیغمبروں میں تھی، انھوں نے ساری دنیا کو چیلنج کر کے انسانیت کے خلاف جاری بغاوت کو روکا، ان کے سامنے لذتیں اور دولتیں لائی گئیں مگر انھوں نے سب کو ٹھکرا دیا اور انسانیت کے درد میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیا۔

پیغمبر اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی تعلیمات آج بھی زندہ ہیں، ان کے قائم کردہ خطوط پر ان کے متبعین نے انسانیت کی مسیحائی کا مورچہ سنبھالا اور اپنے اپنے علاقوں میں یہ خلش پیدا کی اور یہ محسوس کرایا کہ اگر انسانیت نے دم توڑ دیا تو انسانوں اور جانوروں کی زندگی میں کوئی فرق باقی نہیں بچے گا۔

انسانیت کی حقیقی فلاح و بہبود اور اس کی دائمی کامیابی پر سب سے زیادہ زور دینے والا مذہب اسلام ہے۔ اسلامی کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہیں، زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی، اسلام نے ہر موقع کے لیے ایسی تعلیمات دی ہیں کہ ان کو اختیار کرنے والا ایک کامیاب و قابل رشک زندگی گذار سکتا ہے، اسی طرح سماجی زندگی کے لیے بھی اس کی معتدل اور مکمل ہدایات ایسی ہیں کہ وہ دنیائے انسانیت کے لیے ایک بیش بہا عطیہ ہیں، قرآن مجید واحادیث نبوی میں جا بجا اس کی تفصیلات ملتی ہیں اور رسول اکرم (ﷺ) کی زندگی ان کی بہترین تفسیر ہے۔

اسلام اور دیگر ادیان و مذاہب میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ہر مذہب فرد کو خطاب کرتا ہے اور اسی کی اصلاح وترقی پر زور دیتا ہے

جبکہ دین اسلام پوری انسانیت کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے، اس کے لیے عربی و عجمی، کالے اور گورے کا فرق کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اسی طرح جگہ یا رقابت کے حدود، جغرافیائی قیود اور نسلی حد بندیاں اس کے پیغام کی اشاعت میں مانع نہیں بنتیں اور نہ ہی دیگر نظامہائے حکومت کی طرح سیادت وقیادت کے نظریے اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

اسلام ایک ایسا انسانی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے جو پر امن، پر کیف، رنگین اور عدل و مساوات سے بھر پور معاشرہ ہو، جس میں نہ کبر و نخوت کی بو ہو اور نہ حسد و بغض کا شائبہ، نہ طمع و حرص کا گذر ہو اور نہ دل شکنی و دل آزاری کی گنجائش، جن کی وجہ سے ایک انسانی معاشرہ تعفن و سڑاہن کا شکار ہو جاتا ہے، اسی لیے جو چیزیں صالح انسانی سماج کی تشکیل میں مخل ہو سکتی ہیں، دین اسلام نے ان سب پر بڑی باریک بینی کے ساتھ پابندی عائد کر دی ہے۔

معاشرہ میں مرد و عورت، امیر و غریب اور طاقتور و کمزور افراد کی حیثیتیں ہوتی ہیں جن کے لیے اسلام نے مقررہ حقوق بیان کیے ہیں، اس کے رو سے انفرادی زندگی، خاندانی زندگی، سماجی زندگی، اقتصادی زندگی، سیاسی زندگی اور اخلاق و کردار ان سب پہلوؤں پر اسلام نے واضح ہدایات دی ہیں،

اسلام میں جس طرح انسانیت کے احترام کا درس دیا گیا ہے، صالح انسانی معاشرہ کے قیام کی تعلیم دی گئی ہے، اجتماعی و انفرادی حقوق بتائے گئے ہیں اور سماج کے مختلف کمزور طبقات کی حمایت میں پر زور آواز بلند کی گئی ہے اور ان کو انسانی سماج میں برابری کا حصہ دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح جا بجا ایسی صالح اور خیر خواہانہ تعلیمات بھی دی گئی ہیں جن سے ایک بہترین سوسائٹی تیار ہوتی ہے، جس میں نہ کینہ کپٹ ہوتا ہے اور نہ آپس میں بدگمانی اور حسد کا مرض ہوتا ہے، بلکہ سماج کا ہر شخص بلا تفریق مذہب و ملت ایک دوسرے کا بہی خواہ نظر آتا ہے۔

اسلام نے دنیائے انسانیت کو جو اعلیٰ تعلیمات عطا کی ہیں اور وہ انسان کو اخلاق کے جس اعلیٰ معیار پر دیکھنا اور جس بہتر سماج کی تشکیل چاہتا ہے اس کی بہترین تصویر اللہ کے رسول (ﷺ) کی حیات طیبہ اور آپ کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیاں ہیں، حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) ساری دنیا کے لیے رسول بنا کر مبعوث ہوئے، آپ (ﷺ) کی ذات سراپا رحمت اور آپ کی تعلیمات پوری دنیائے انسانیت کے لیے یکساں مفید تھیں۔

یوں تو اس دنیائے ارضی میں درد و محبت اور سوز دروں رکھنے والے بہت سے آئے اور گئے، بہتوں نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کی مہم چلائی، پیار و محبت کی سریلی بانسری بجائی، دلوں کے درد کا مداوا کیا، مگر آنحضرت (ﷺ) کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ بلا تفریق رنگ و نسل ساری انسانیت کے لیے رحمت بن کر آئے، آپ کی آمد سے پوری انسانیت کے تن مردہ میں جان پڑ گئی، انسانیت کی سوکھی کھیتی لہلہاتی نظر آنے لگی اور سماج کا کوئی طبقہ ایسا نہیں بچا جو آپ (ﷺ) کے فیضان رحمت سے محروم رہا ہو۔اپنے و پرائے، جگری دوست و جانی دشمن، صف یاراں و صف دشمناں ہر کسی نے آپ کے فضل و کرم اور آپ (ﷺ) کے بے پایاں احسانات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

آپ (ﷺ) کے احترام انسانیت کا جذبہ سمجھنے کے لیے صرف یہ ایک روایت کافی ہے کہ ایک مرتبہ آپ (ﷺ) اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اسی درمیان سامنے سے ایک یہودی کا جنازہ نکلتا ہوا نظر آیا، آپ (ﷺ) جنازہ کے احترام میں فوراً کھڑے ہو گئے، بعض صحابہ نے عرض بھی کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، مگر آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تو کیا ہوا وہ یہودی بھی تو ایک انسان ہی تھا۔

الغرض ایک بہتر و مثالی سماج کی تشکیل کے لیے جو تعمیری تعلیمات ممکن تھیں، اسلام نے وہ سب دنیائے انسانیت کو عطا کیں اور بغیر کسی مذہبی تفریق کے پوری انسانیت کو اس سے مستفید ہونے کی دعوت دی۔

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

شیخ الاسلام جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

’’آج حرام خوری شیر مادر بن چکی ہے، ہر آدمی کا منہ کھلا ہوا ہے کہ کسی طرح حرام کھالوں اور جس طرح بھی پیسے بن پڑے بنالوں، چاہے وہ حلال طریقہ سے ہو یا حرام طریقہ سے ہو، دھوکہ سے ہو یا فریب سے ہو، جھوٹ بول کر ہو یا رشوت دے کر ہو، کسی بھی طریقہ سے ہو، لیکن میرے پاس پیسے آنے چاہیے، آج ہمارے ملک کو اللہ تعالیٰ نے اتنے وسائل دیے ہیں کہ اس کی کوئی حد وحساب نہیں، لیکن لوگ ان وسائل کو حرام طریقہ سے کھارہے ہیں، اس کے نتیجہ میں وہ وسائل ضائع ہورہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالم اسباب بنایا ہے، لہٰذا اگر ان بداعمالیوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کی پٹائی ہورہی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اتنی دعائیں مانگیں مگر قبول نہ ہوئیں، یاد رکھئے! اگر ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان دعاؤں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مشرق کی طرف جارہا ہو اور دعا یہ کررہا ہو کہ یا اللہ! مجھے مغرب میں پہنچا دیجیے، وہ دعا کیسے قبول ہوگی؟ آج ہم لوگوں نے راستہ تو وہ اختیار کیا ہے جو تباہی کا راستہ ہے اور دعائیں یہ مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں عافیت اور سلامتی دے دیجیے، بتائیے! یہ دعائیں کیسے قبول ہوں گی؟

ہاں جو لوگ اخلاص کے ساتھ دعائیں مانگ رہے ہیں اور مانگتے رہے ہیں، ان کی دعا کی قبولیت تو یقینی ہے کہ انشاء اللہ ان کو ان دعاؤں پر اجر وثواب ملے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور دعائیں کرنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور اس کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، لہٰذا ان دعاؤں کا یہ فائدہ تو بے شک ان کو حاصل ہوگا، لیکن دنیا میں ان دعاؤں کے نتائج اسی وقت ظاہر ہوں گے جب تم اپنے حالات تبدیل کروگے۔

اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتے، جب تک لوگ اپنے حالات خود نہ بدلیں، لہٰذا جب تک اپنے حالات کی اصلاح نہیں کروگے اور جب تک اس بات کا تہیہ نہیں کروگے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو زہر قاتل سمجھنا ہے اور جب تک اس بات کا تہیہ نہیں کروگے کہ حرام کا کوئی لقمہ پیٹ میں نہیں جائے گا اور جب تک اس بات کا تہیہ نہیں کروگے کہ ہم جو کچھ کریں گے وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے کریں گے، اس وقت تک یہ صورت حال نہیں بدل سکتی۔

بہر حال! مایوسی کی بات نہیں اور نہ غیر معمولی صدمہ کرنے کی بات ہے، صدمہ تو بے شک ہے، لیکن اس صدمہ کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ حالات کو درست کرنے کی فکر کرنی چاہیے، اپنے حالات کا جائزہ لے کر، اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور پھر اپنے حالات کو درست کریں، اپنے اخلاق کو درست کریں، اپنی معیشت کو درست کریں اور اپنی معاشرت کو درست کریں، جب تک ہم یہ نہیں کریں گے، اس وقت تک پٹائی تو ہوگی۔‘‘

(اصلاحی خطبات: ۲۰/۱۲۴-۱۲۶)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 14 ⚜ August 2022 ⚜ Issue: 08

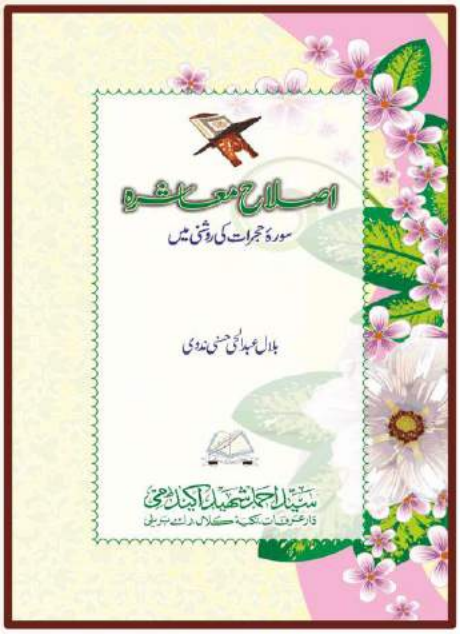

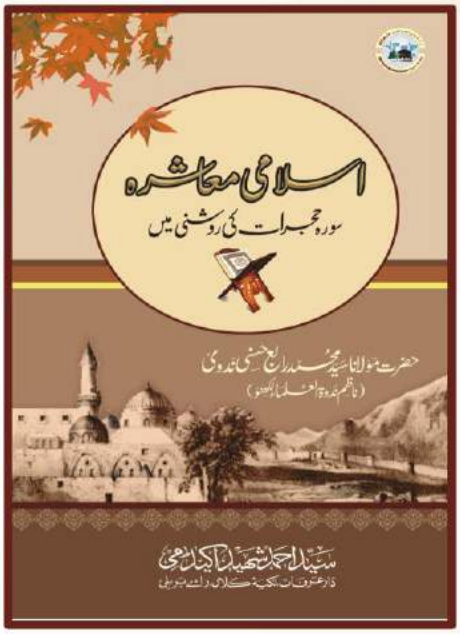

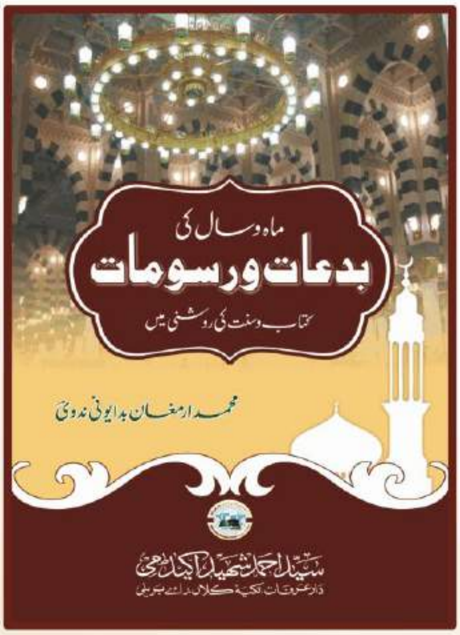

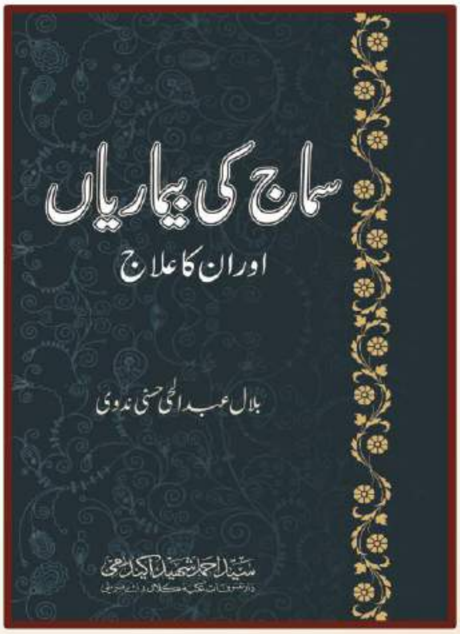

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)